بحث و تحقیق

حضرت مولانا محمد طاسین مدظلہ
مجلس علمی کراچی

ادھار چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کی شرعی حیثیت

زیر نظر مضمون میں میرا اصل مقصد، جس خاص مسئلہ کی شرعی حیثیت سے بحث و تحقیق کرنا ہے وہ مسئلہ ہے ادھار پر کوئی چیز اس قیمت سے زائد قیمت پر فروخت کرنا جو قیمت اس چیز کی بازار میں بصورت نقد رائج ہو مثلاً ایک چیز جس کی قیمت بازار میں عام طور پر بصورت نقد ایک سو روپے ہے اس کو مثلاً ایک سال کے ادھار پر ایک سو پچاس روپے میں فروخت کرنا اور خریدنا۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کیا ہے یعنی اس میں جس معاشی معاملے کا ذکر ہے قرآن و حدیث کی رو سے یہ جائز معاملہ ہے یا ناجائز معاملہ؛ اس بحث و تحقیق میں اس کا تعین کرنا اصل مقصود ہے اور یہ اس لیے کہ متعدد اشخاص نے مجھ سے یہ مسئلہ پوچھا ہے اور یہ ایک زندہ مسئلہ ہونے کے ساتھ اپنے اثرات و عروضی نتائج کے لحاظ سے بڑا اہم اور ضروری مسئلہ بھی ہے۔

بحث کے شروع میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ حقیقت میں کسی مسئلہ و معاملہ کے متعلق شرعی حکم صرف وہی ہو سکتا ہے جس کا تفصیلی یا اجمالی ثبوت قرآن و حدیث میں موجود ہو کیونکہ شریعت اسلامی کا حقیقی ماخذ و سرچشمہ صرف قرآن و حدیث ہیں لہٰذا اصلاً اس بحث کا دائرہ انہی تک محدود رہے گا، تعامل صحابہ کرام دراصل کتاب و سنت پر مبنی ہے لہٰذا کسی مسئلہ اور معاملہ کی شرعی حیثیت متعین کرنے کے لیے اس کو دیکھنا اور اس سے فائدہ اٹھانا بھی ضروری ہے، محدثین کرام کے ہاں حدیث کا جو وسیع مفہوم ہے اس میں آثارِ صحابہؓ بھی شامل ہیں، مطلب یہ کہ کسی ادر معاملہ کے شرعی جواز و عدم جواز کے متعلق صرف اتنا کافی نہیں کہ فقہ و فتاویٰ کی فلاں کتاب میں فلاں فقیہ نے اس کو جائز یا ناجائز کہا اور لکھا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث کی اس نص اور دلیل کا ذکر بھی ضروری ہے جس کی بنا پر اس فقیہ نے ایسا کہا اور لکھا ہے اور یہ اس لیے بھی کہ وفاقی شرعی عدالت کے جج حضرات کسی فقیہ کے قول کو صرف اس وقت مانتے ہیں جب اس کے ساتھ قرآن و حدیث کی کوئی دلیل موجود ہو کیونکہ دستور مملکت پاکستان کے اندر صرف قرآن و حدیث کو اسلامی احکام کا ماخذ تسلیم کیا گیا ہے۔

اصل مسئلہ پر بحث سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں تک ادھار و قرض پر کوئی چیز بیچنے اور خریدنے

کا تعلق ہے قرآن وحدیث کی رو سے قطعی طور پر جائز ہے اس کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیت مداینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث پیش کر دینا کافی ہیں جن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسروں سے ادھار پر ضرورت کی چیزیں لینے کا واضح بیان ہے اور یہ بھی کہ بعض دفعہ ادائیگی کے وقت آپؐ نے بہتر طور پر ادائیگی فرمائی قرآن وحدیث میں قرض حسنہ کے متعلق جو تعلیم ہے اس سے بھی صریح طور پر اس ادھار کا جواز ثابت ہوتا ہے جس پر کوئی اضافہ نہ ہو، کسی ضرورت مند کو ادھار پر اس کی ضرورت کی چیز اسی قیمت پر دینا جو نقد کی صورت میں ہو قرضۂ حسنہ کی تعریف میں آتا ہے جو بڑے اجر وثواب کا نیک عمل ہے بعض احادیث میں اس کو صدقہ سے تعبیر فرمایا ہے جو نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ مستحب ومستحسن عمل ہے۔

اسی طرح بیع مرابحہ کی بھی وہ شکل قطعی طور پر جائز ہے جس میں فروخت کی جانے والی شے کی اصل قیمت بھی صحیح بتلائی گئی اور اس پر نفع کی مقدار بھی صرف اتنی لگائی گئی ہو جو تاجروں کے ہاں اور بازار کے عام رواج کے مطابق ہو یا اس سے بھی کم ہو، مثلاً اگر بازار میں عام طور پر نفع کی مقدار دس فیصد رائج ہو اور مرابحہ میں فروخت کرنے والا فروخت کی جانے والی شے کی اصل قیمت پر زیادہ سے زیادہ دس فیصد نفع لگائے مثلاً جو شے اس کو سو روپے میں پڑی ہے اس پر نفع دس روپے یا اس سے کمی لگا کر بیع مرابحہ کے طور پر فروخت کرے تو اس کے جواز میں کوئی شک وشبہ نہیں، بالفاظ دیگر بازار میں عام نرخ کے مطابق ایک چیز کی قیمت ایک سو روپے تھی اور مرابحت کی شکل میں بھی وہ ایک سو روپے میں ہی فروخت کی گئی یا مثلاً رعایت کے ساتھ ایک سو پانچ میں فروخت کی گئی تو بیع مرابحہ کی یہ صورت بالکل جائز ہوتی ہے اور شرعی طور پر یہ معاملہ قطعاً درست ہوتا ہے کیونکہ اس میں فریقین معاملہ کی حقیقی رضامندی موجود ہوتی ہے اور یہ اس وجہ سے موجود ہوتی ہے کہ اس میں ہر فریق کے لیے اس کی چیز کا اس کی مرضی کے مطابق معاوضہ پایا جاتا ہے جو قلبی رضامندی کا خارجی اور معروضی معیار ہے، بخلاف مرابحت کی ایسی شکل کے کہ جس میں فروخت کرنے والا خریدار کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی چیز بازار کے مقابلہ میں کہیں زیادہ نفع پر فروخت کرتا ہے مثلاً یہ دیکھتے ہوئے کہ خریدار نقد ادائیگی نہیں کر سکتا کچھ عرصہ کے ادھار پر لینا چاہتا ہے لہٰذا ادھار کی وجہ سے نفع دس فیصد کی بجائے بیس یا تیس فیصد لگا دیتا ہے اس صورت میں خریدار کی اگرچہ ظاہری طور پر رضامندی موجود ہوتی ہے لیکن حقیقی طور پر موجود نہیں ہوتی کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ جو چیز وہ ادھار کی وجہ سے مثلاً ڈیڑھ سو روپے میں خرید رہا ہے وہ بازار میں بصورت نقد سو روپے میں ملتی ہے اور یہ کہ فروخت کرنے والا دوسرا فریق اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پچاس روپے کا اضافہ کر رہا ہے چنانچہ وہ ضرورت کے تحت لے تو لیتا ہے لیکن دل سے خوش نہیں ہوتا اس لیے کہ اس کے لیے پچاس روپے کا مادی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لہٰذا مرابحہ کی یہ شکل بلحاظ حقیقت درست نہیں ہوتی بلکہ باطل معاملہ کی تعریف میں آتی ہے اس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

اَب میں اپنے اصل مسئلہ کی طرف آتا ہوں یعنی یہ کہ ادھار کی صورت میں کوئی چیز نقد قیمت کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنا شرعًا کیسا ہے جائز ہے یا ناجائز ؟ جہاں تک جواز کا تعلق ہے انتہائی تلاش وجستجو کے باوجود مجھے قرآن حکیم، احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی ایسی دلیل نہیں مل سکی جس سے معاملہ مذکور کا جواز نکلتا اور ثابت ہوتا ہو، البتہ عدم جواز کے متعلق قرآن، حدیث اور آثار صحابہ میں واضح اور قطعی دلائل ملتے ہیں، تحریم ربٰو سے متعلق جو آیات، احادیث اور آثار ہیں ان سے معاملہ زیر بحث کا قطعی طور پر ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے وہ اس طرح کہ قرآن حکیم نے عہد جاہلیت کی جس متعارف ربٰو کو قطعی طور پر حرام وممنوع قرار دیا ہے اس کی چند شکلوں میں سے ایک شکل یہ بھی تھی کہ ایک شخص دوسرے پر کوئی چیز ادھار بیچتا تو مدت قرض کے لحاظ سے اس کی قیمت میں اضافہ کرتا مثلاً ایک چیز جس کی قیمت بازار میں ایک سو درہم ہوتی ایک سال کے ادھار پر ڈیڑھ سو درہم میں بیچتا پھر جب ایک سال کے بعد بھی مقروض ڈیڑھ سو درہم ادا نہ کر سکتا تو قرض خواہ اس سے کہتا میں مدت قرض میں مزید اتنا اضافہ کر دیتا ہوں تم اپنے ذمہ رقم کی مقدار اتنی بڑھا دو خرچہ رقم قرض کی مقدار مزید ایک سال کے لیے دو سو درہم کر دی جاتی پھر اگر دوسری مدت میں بھی وہ ادا نہ کر سکتا تو مزید مہلت کے عوض قرض کی رقم میں مزید اضافہ کر دیا جاتا بڑھتے بڑھتے یہ رقم اصل کے کئی گنا ہو جاتی یعنی اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً بن جاتی، یہی حال نقد کے قرض میں بھی ہوتا ہے ایک آدمی دوسرے کو مثلاً سو درہم ایک سال کے لیے قرض دیتا تو اس مدت کے لحاظ سے اس میں اضافہ کر دیا جاتا جو درمیان میں ہر ماہ یا سال کے بعد یکمشت اصل کے ساتھ واجب الادا ہوتا جیسا کہ موجودہ بینکاری نظام میں ہوتا ہے۔ غرضیکہ قرآن حکیم نے ربٰوالنسیئۃ کی جن مروجہ شکلوں کو حرام قرار دیا ان میں ایک شکل ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنے کی شکل بھی تھی جس کا اظہار مندرجہ ذیل روایات سے ہوتا ہے جن کو مفسرین کرام نے تحریم ربٰو کی آیات کی تفسیر میں نقل کیا ہے :-

(۱) عن زید بن اسلم رضی اللہ عنہ قال کان الربٰو الذی اذن اللہ فیہ بالحرب لمن لم یترکہ عند الجاھلیۃ یکون للرجل علیٰ رجل حق الی اجل فاذا اجل الاجل قال صاحب الحق أتقضی م تربی، فان قضاہ اخذ منہ والا طواہ۔

(جامع الاصول ج ۱ ص ۵۷۳)

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا وہ ربٰو جس کو ترک نہ کرنے والوں کے لیے اللہ تعالےٰ نے اعلان جنگ فرمایا عہد جاہلیت میں اس کی شکل اس طرح تھی کہ آدمی کا دوسرے پر ایک خاص مدت تک کے حق یعنی دین و قرض ہوتا پس جب مقررہ وقت آتا تو صاحب حق یعنی قرض خواہ اپنے مقروض سے کہتا ادا کرتے ہو یا مزید مہلت کے عوض مال قرض میں اضافہ کرتے ہو اگر وہ ادا کرتا تو لے کر معاملہ ختم کر دیتا ورنہ اس کو تہہ مرتبہ بڑھاتا چلا جاتا۔

(۲) عن مجاھد انہ قال فی ربٰو الذی

حضرت مجاہدؒ نے فرمایا وہ ربٰو جس سے اللہ تعالےٰ نے

نهی الله عنه كان في الجاهلية يكون للرجل على الرجل دين، فيقول لك كذا وكذا وتؤخر عنى فيؤخر عنه۔

(تفسیر الطبری ج ۳ ص۶۷)

منع فرمایا عہد جاہلیت میں اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کا دوسرے آدمی پر واجب الادا۔ دین و قرض ہوتا جب ادائیگی کا مقررہ وقت آتا تو مقروض آدمی اپنے قرض خواہ سے کہتا مہلت بڑھادو اور مطالبہ موخر کر دو اس کے بدلے آپ کے لیے اتنا اتنا مزید ہوگا چنانچہ وہ مطالبہ موخر کرکے مہلت بڑھا دیتا اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا۔

(۳) عن سعيد بن جبير قال ان الرجل كان يكون له على الرجل المال فاذا احل الاجل طلبه من صاحبه فيقول المطلوب اخر عنى وازيدك في مالك فيفعلان ذلك۔

(تفسیر الدر المنثور ج ۲ ص۷)

حضرت سعید بن جبیر نے ربوٰ جاہلی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا وہ اس طرح تھی کہ ایک آدمی کا دوسرے آدمی پر بطور قرض مال ہوتا پھر جب قرض کی مقررہ مدت پوری ہوتی تو قرض والا اپنے مقروض سے اپنا مال طلب کرتا پھر اگر مقروض ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوتا تو مقروض سے کہتا مجھے مزید مہلت دیجئے میں اس کے عوض آپ کے مال میں آپ کے لیے اضافہ کر دیتا ہوں چنانچہ وہ آپس میں ایسا کر لیتے اور یہ سلسلہ جاری رہتا۔

(۴) عن قتاده قال ان ربو الجاهلية يبيع الرجل المبيع الى اجل مسمى فاذا احل الاجل ولم يكن عند صاحبه قضاء زاده واخر عنه۔

(تفسیر الطبری ج ۳ ص۶۷)

حضرت قتادہؒ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا ربوٰ جاہلی کی ایک شکل یہ تھی کہ ایک آدمی اپنی کوئی چیز ایک خاص وقت تک کے لیے قرض پر بیچتا پھر جب وہ خاص وقت آتا اور اس کے مقروض کے پاس ادائیگی کا انتظام نہ ہوتا تو مال بڑھا کر مزید مہلت دے دیتا۔

(۵) عن عطاء ابن ابی رباح قال كانت ثقيف تداين في بني المغيرة في الجاهلية فاذا احل الاجل قالوا نزيدكم وتوخرون۔

(تفسیر الدر المنثور ج ۲ ص۵۹)

حضرت عطاء بن ابی رباح نے فرمایا عہد جاہلیت میں بنو ثقیف، بنو المغیرہ کو قرض دیا کرتے تھے۔ جب ادائیگی کا مقررہ وقت آتا تو بنی المغیرہ، بنو ثقیف سے کہتے ہم تمہارا مال زیادہ کر دیتے آپ ہمیں مزید مہلت دے دیجئے۔

ان مذکورہ روایات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ربوٰ الجاہلی جس کا دوسرا نام ربوا النسیۃ ہے قرض کا ایسا معاملہ

تھا جس میں مہلت اور مدت قرض کے عوض مال قرض میں اضافہ کیا جاتا تھا خواہ وہ قرض نقد کی صورت میں ہو یا کسی فروخت کردہ چیز کی قیمت کی صورت میں، اور یہ کہ اس کو قرآن حکیم نے حرام و ممنوع ٹھہرا کر اس خیال کی نفی اور تردید کر دی کہ قرض دینے والا مہلت قرض کے عوض مقروض سے قرض کے اصل مال پر کچھ بھی زائد مال مل سکتا ہے۔

مناسب اور مفید سمجھتا ہوں کہ یہاں اکابر مفسرین کرام کی کچھ عبارات پیش کر دوں جو انہوں نے ربائے جاہلی کی تفسیر میں فرمائی ہیں تاکہ حقیقت حال اچھی طرح واضح ہو جائے۔

امام ابوبکر الجصاص نے اپنی جلیل القدر فقہی تفسیر احکام القرآن میں ربوٰ کی تفسیر میں تحریر فرمایا ہے:۔

والربوٰ الذی کانت العرب تعرفه وتفعله انما کان قرض الدراهم والدنانیر الی اجل بزیادة علی مقدار ما استقرضه علی ما یتراضون به، هذا کان المتعارف المشهور عندهم۔

(ج ۱ ص ۵۵۲)

وہ ربوٰ جس کو اہل عرب جانتے پہچانتے اور کیا کرتے تھے اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ ایک مقررہ مدت تک دراہم و دنانیر کے قرض کا معاملہ تھا جس میں یہ طے پاتا تھا کہ قرض کے اصل مال پر کچھ زائد بھی ضرور لینا دینا ہوگا ربوٰ کا یہی معاملہ عربوں کے ہاں متعارف اور مشہور تھا۔

اس سے کچھ آگے ایک اور عبارت اس طرح ہے۔

ولم یکن تعاملهم بالربوٰ الا علی الوجه الذی ذکرنا من قرض دراهم ودنانیر الی اجل مع شرط الزیادة۔

(بحوالۂ مذکور)

عربوں کے اندر جس ربوٰ پر عمل درآمد تھا اس کی وہی شکل تھی جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا یعنی ایک خاص مدت تک دراہم و دنانیر کا قرض جس کے ساتھ زیادتی کی شرط تھی۔

پھر دو صفحات کے بعد ایک تیسری عبارت احکام القرآن میں بایں طور ہے۔

انه معلوم ان الربوٰ الجاهلیة انما کان قرضًا موجلًا بزیادة مشروطة فکانت الزیادة بدلا من الاجل، فابطله الله وحرّمه وقال وان تبتم فلکم رؤوس اموالکم لا تظلمون

یہ ایک معلوم اور جانی ہوئی بات ہے کہ عہد جاہلیت کی ربوٰ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ زیادتی کی شرط کے ساتھ میعادی قرض کا معاملہ تھا اور اس میں قرض کے اصل مال پر جو زیادتی ہوتی تھی وہ مدت اور مہلت قرض کا بدل سمجھی جاتی تھی پس اس کو اللہ تعالیٰ نے باطل قرار دیا اور فرمایا: اگر تم اس سے توبہ کر کے باز آجاؤ تو پھر تمہارے لیے صرف تمہارے اصل اموال

ولا تظلمون ۔

(ج ۱ ۔ ص ۵۵۴)

ہیں جو تم نے بطور قرض دیئے تھے نہ تم ان پر کچھ زائد لے
کر اپنے مقروضوں پر ظلم کرو اور نہ وہ تمہارے اصل مال
روک کر تم پر ظلم کریں ۔

واضح رہے کہ یہاں ظلم کے معنی حق تلفی کے ہیں ۔

اس تیسری عبارت میں جو بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ قرض کے اصل مال پر جو زیادتی مشروط ہوتی تھی وہ اجل یعنی مدت قرض کا عوض اور بدل سمجھی جاتی تھی ۔

دوسرے مفسر امام فخر الدین الرازی نے اپنی عظیم المرتبت تفسیر مفاتیح الغیب میں جو تفسیر الکبیر کے نام سے معروف ہے ربٰو کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

اما الربٰو النسية فهو الامر الذی
كان مشهورا متعارفا فی الجاهلية وذلك
انهم كانوا يدفعون المال على ان
ياخذوا كل شهر قدرًا معينًا
ويكون رأس المال باقيا ،
ثم اذا حل الدين طالبوا المديون
برأس المال ، فان تعذر عليه الاداء
زادوا فی الحق والاجل ، فهذا
هو الربٰو الذی كانوا فی الجاهلية
يتعاملون ۔ (ج ، ص ۹۱)

البتہ ربٰو النسیۃ جو عہد جاہلیت میں مشہور اور متعارف تھی
عملاً اس کی شکل اس طرح تھی کہ بعض لوگ اپنا مال
دوسروں کو بطور قرض اس شرط پر دیتے کہ وہ ہر ماہ
اپنے مقروض سے خاص مقدار میں کچھ مال بطور سود لیتے
رہیں گے اور قرض کا اصل مال اپنی حالت پر باقی رہے
گا پھر جب ادائیگی کا مقررہ وقت آتا تو وہ مقروض سے
اصل مال کا مطالبہ کرتے پھر اگر ادائیگی اس کیلئے مشکل
ہوتی تو اپنے حق اور قرض کی مہلت میں اضافہ کر دیتے
پس یہی وہ ربٰو تھی جس کا لوگ عہد جاہلیت لین دین اور
کاروبار کرتے تھے ۔

تفسیر الکبیر ہی میں ربٰو سے متعلق ایک اور عبارت اس طرح ہے ۔

كان الرجل فی الجاهلية اذا
كان له على انسان مائة درهم
الى الاجل ، فاذا جاء الاجل ولم يكن
المديون واجدا لذلك قال زدنی فی
المال حتى ازيد فی الاجل ، فربما
جعله مائتين ۔ (ج ۹ ص ۲)

زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی کے کسی انسان پر ایک
خاص وقت کے لیے ایک سو درہم قرض ہوتے پھر
جب وہ وقت آتا اور مقروض کے پاس ادائیگی کے
لیے مال نہ ہوتا تو وہ کہتا تم میرے حق میں اضافہ کر دو
تاکہ میں اجل کو زیادہ کر دوں پس بسا اوقات وہ سو
درہم کے دو سو درہم کر دیتا ۔

مذکورہ عبارات میں اس کی تصریح ہے کہ عہد جاہلیت کی ربوٰ جس کو قرآن مجید نے قطعی حرام بتلایا ہے اس کے اندر جو مرکزی تصور کارفرما تھا وہ یہ کہ مقرض یعنی قرض دینے والا، مدت قرض کے بدلے قرض کے اصل مال پر کچھ زائد مال کا حقدار قرار پاتا ہے قرآن حکیم نے اس ربوٰ کو حرام قرار دے کر اور یہ فرما کر کہ مقرض اپنے اصل مال پر جو بھی زائد لیتا ہے وہ اس کا حق نہیں ہوتا بلکہ مقروض کا حق ہوتا ہے، تصور مذکور کی نفی کر دی ہے گویا یہ فرمایا کہ اجل اور مدت قرض کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی مال کا بدل بن سکتی اور جس کا کوئی معاوضہ لیا دیا جا سکتا ہو۔

یہاں تک ربوٰ الجاہلی اور ربوٰ النسیۃ کی حقیقت و ماہیت اور اس کی شرعی حیثیت کے متعلق قدرے تفصیل کے ساتھ جو کچھ لکھا اور عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں جب ہم اپنے زیر بحث معاملے کا تحقیقی جائزہ لیتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ معاملہ اپنی حقیقت و ماہیت، اپنے منشا و مقصد اور اپنے لازمی اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربوٰ النسیۃ جیسا معاملہ ہے وہ اس طرح کہ اس میں ایک شے جس کی قیمت نقد سے بازار میں عام طور پر مثلاً ایک سو روپے ہوتی ہے جب ایک سال کے ادھار پر وہ ایک سو پچاس روپے میں بیچی جاتی ہے تو اس میں پچاس روپے کا جو اضافہ ہوتا ہے وہ دراصل ایک سال کی مدت و مہلت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ نیز جس طرح ربوٰ النسیۃ میں مقروض سے قرض کے اصل مال پر زائد لیا جانے والا مال بلا عوض ہوتا اور مقروض کی حق تلفی قرار پاتا ہے اسی طرح زیر بحث معاملے میں بیچی جانے والی شے کی اصل قیمت پر ادھار کی وجہ سے جو اضافہ ہوتا ہے بیچنے والے کی طرف سے خریدار کے لیے اس کا کوئی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لہٰذا بیچنے والا جو زائد لیتا ہے خریدار کا حق لیتا اور اس کی حق تلفی کرتا ہے، نیز جس طرح ربوٰ النسیۃ میں قرض دہندہ کا مقصد بغیر کسی دماغی جسمانی محنت و مشقت کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی ضمانت کے اپنے سرمائے اور تمول کو بڑھانا ہوتا ہے اسی طرح زیر بحث بیع المؤجل کے معاملہ میں فروخت کنندہ کا مقصد بغیر کسی پیداآور محنت اور عملی جد و جہد کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی ذمہ داری کے نفع کمانا اور اپنے سرمائے کو بڑھانا ہوتا ہے، پھر جس طرح ربوٰ النسیۃ کے معاشرے میں معاشی عدم توازن اور غیر فطری نشیب و فراز رونما ہوتا اور ملکی دولت چند اغنیا۔ اور سرمایہ داروں کے درمیان سمٹ کر رہ جاتی ہے اسی طرح زیر بحث معاملہ کے بھی عام رواج سے معاشرے میں ویسی ہی معاشی حالت پیدا ہوتی ہے غرضیکہ وہ تمام اخلاقی، معاشرتی اور معاشی برائیاں جو ربوٰ النسیۃ کے عملی رواج سے ظہور میں آتی اور معاشرے کے توازن کو بگاڑتی ہیں اور جن کی وجہ سے اسلام نے ربوٰ النسیۃ کو قطعی طور پر حرام اور ممنوع ٹھہرایا ہے وہ سب زیر بحث بیع مؤجل کے معاملہ سے بھی لازماً ظہور میں آتی ہیں لہٰذا اصول قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس معاملہ کا بھی وہی شرعی حکم ہونا چاہیے جو معاملہ ربوٰ النسیۃ کا ہے یعنی حرام کیونکہ بنیادی طور پر ان کے درمیان کچھ فرق نہیں صرف لفظی فرق ہے جس کا عقود و معاملات میں شرعاً کوئی لحاظ اور اعتبار نہیں ہوتا۔ الاعتبار فی العقود للمقاصد والمعانی لا للالفاظ والا لما مسلمہ قاعدہ کلیہ ہے۔ (جاری ہے)